اردو غزل کے حوالے سے سرسید کا حاسۂ انتقاد

رابعہ مقدس*

Abstract:

Before Sir Syed Urdu criticism about Urdu Ghazal does not connect itself with the subject narrated in it. It deals only with the poetic aesthetic only. Sir Syed is the very first man in Urdu criticism who analysis the subject narrated in it. He thinks this form may be need for moral, political, cultural and historical subject too. He condemn the poets who only used their genre for their falls feeling and the experience. He thinks that the language of the form should be simple and near to daily uses instead of constructed one or artificial.

۱۸۵۷ء برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کا ایسا باب ہے جس میں یہاں کے باسیوں کی سیاسی و سماجی اور نظریاتی زندگی میں ہلچل، تبدیلی، تنوع، شکست و ریخت کی کہانی ثبت ہے۔ یہ زمانہ وہ زمانہ ہے جہاں سے برصغیر کے باسیوں کی زندگی میں یک لخت ایک ایسی تبدیلی رونما ہوتی ہے گویا یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہاں کے تمام نظام ہائے حیات پر نظر ثانی کی جانے لگی ہے چنانچہ سیاست، سماجی نظریات، مذہبی اعتقادات اور رسومات، معاشرتی اقدار و روایات، تعلیمی افکار و خیالات، ادبی میلانات و رجحانات سبھی امور میں رد و قدح کا ایک شدید رویہ پنپنے لگا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری کا خاتمہ اور انگریز حکومت کا قیام متذکرہ بالا تمام تبدیلیوں کے پس منظر میں کارفرما نظر آتے ہیں۔ چنانچہ نئی انگریز حکومت کی رعایا میں برصغیر کے ہندو اور مسلمان دونوں قومیں شامل تھیں۔ غدر کی ذمہ داری بظاہر مسلمانوں پر عائد کی جانے کے بعد ہندوؤں اور انگریزوں کے درمیان فاصلہ کم ہوا جبکہ مسلمانوں

* سکالر شعبۂ اُردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اور انگریزوں میں آویزش واختلاف کی شرح بڑھ گئی۔ چنانچہ ایک اعتبار سے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ساری ذمہ داری مسلمان قوم کے سر تھوپ دی گئی اور مسلمانوں ہی کو زیرِ عتاب ٹھہرایا گیا چنانچہ

> سب سے بڑا نقصان مسلمانوں کو پہنچا۔ ان کا نہ صرف اقتدار ختم ہوا بلکہ تہذیب و ثقافت اور تعلیم کے ذرائع کو بھی نقصان پہنچا۔ انہیں پیچھے دھکیلے جانے کا عمل شروع ہو گیا۔(۱)

مسلمان برصغیر پر ایک طویل عرصے تک حکمرانی کرتے رہے تھے۔ چنانچہ مغلیہ سلطنت کا زوال انگریزوں کی مخالفت اور قومی رہبری وقیادت کا فقدان تین ایسے امور تھے جنہوں نے مسلمان قوم کی آزمائش شدید تر کر دی تھی۔ چنانچہ اس بے بسی و بے چارگی کے عالم میں قیادت کا فریضہ نبھانے کے لیے سرسید احمد خان آگے بڑھے۔ انہیں حالات، اس کے نتائج اور مطلوبہ اقدامات کا اندازہ تھا چنانچہ وہ کمر باندھ کر میدان میں اتر آئے۔

غدر کے بعد مسلم قوم تین بڑے گروہوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک گروہ تو وہ تھا جو نئی حکومت سے مفاہمت و تعاون کی ضرورت واہمیت کا سرے سے منکر تھا۔ دوسرا گروہ وہ تھا جو انگریز حکومت سے انتہائی محتاط طریقے سے تعاون واکتساب کا حامی تھا۔ تیسرا گروہ وہ تھا جو حکومت وقت سے مفاہمت وتعاون واکتساب کا قدرے زوردار آواز میں نعرہ لگا رہا تھا۔ سرسید احمد خان کا تعلق اسی تیسرے گروہ سے تھا چنانچہ ثقافتی، سماجی، تعلیمی، نظریاتی اور ادبی سطح پر سرسید احمد خان نے مفاہمت واکتساب کا ہاتھ بلا قید وشرط بڑھایا۔ سرسید کی اس سعی کے اثرات ونتائج وثمرات مسلمانوں کے حق میں پورے طور پر تو مفید وشیریں نہیں تھے۔(۲) ہاں البتہ نئی حکومت کے حق میں یہ عمل یقیناً بنیادی اہمیت کا حامل تھا۔ چنانچہ اپنی تہذیب وثقافت کی ترویج کرنے، انگریزی زبان کی تبلیغ وبالادستی قائم کرنے، علم وادب اور تعلیمی میدان میں اپنی رہبری منوانے اور سیاسی وسماجی لحاظ سے ہندوستان میں اپنی اجنبیت کو مانوسیت میں بدل دینے کے امکانات کو بھانپ لیا۔ مسلمان قوم کے حوالے سے سرسید کے مفاہمتی اور مصالحتی اقدام کا نتیجہ ڈاکٹر رشید امجد کے لفظوں میں یہ ہوا کہ انگریزوں نے زیادہ کھل کر ثقافتی اور فکری یلغار کا آغاز کیا۔ اس کا پہلا ہدف زبان بنی۔۔۔ اردو نے آسانی سے فارسی کی جگہ لے لی۔ فارسی کا رخصت ہونا ماضی کی شان وشوکت اور اقتدار کے طویل دور کا جانا ہی نہ تھا بلکہ برصغیر میں مسلمانوں کی ایک بڑی تہذیب کی موت تھی۔(۳)

سرسید احمد خان کا مفاہمتی ومصالحتی عمل ان کے اپنے عہد کے حالات کے تناظر، علم قوم کے سردست موجود وسائل وامکانات اور قوم کے رہے سہے خونِ زندگی کے چند ایک قطروں کے تحفظ کی ضرورت واہمیت سے یقیناً مثبت اور مفید تھا۔ چنانچہ غدر سے پیدا ہونے والی ہولناک اور تباہ کن صورت حال کا درست اندازہ مسلمانوں کی

طرف سے سرسید ہی نے لگایا۔

> ایک طرف تو وہ چاہتے تھے انگریزوں کے دل سے اس غلط فہمی کو رفع کر سکیں جو جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے سبب سے در آئی تھی اور دوسری طرف وہ اپنی قوم کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ نئے عہد کی نئی ضروریات کو سمجھیں اور انہیں اختیار کیے بغیر آگے بڑھنا تو درکنار اپنے وجود کو برقرار رکھنا بھی ممکن نہیں ہے۔ (۴)

قومی اصلاح کے وسیع تر اور عظیم تر فریضے کی ادائیگی کے لیے سرسید نے صحافت اور ادب سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ چنانچہ علی گڑھ تحریک جو سرسید نے چلائی تھی اس کی ترویج و استحکام میں بھی صحافت و ادب نے بنیادی کردار ادا کیا۔ تہذیب و ثقافت، اخلاق کی ترویج و اصلاح کے حوالے سے سرسید کے سامنے انگلستان کے سپیکٹیٹر اور ٹیٹلر جیسے رسالوں کا کردار تھا۔ ان رسالوں کے ایڈیٹر سٹیل اور ایڈیسن کے انداز و اسلوب اور مضامین کی برجستگی سے سرسید بہت مرعوب تھے چنانچہ ''ان دو مصنفوں کو سرسید تہذیب کا پیغمبر شمار کرتے تھے''۔ (۵)

''تہذیب الاخلاق'' کے اجراء کے محرکات و مقاصد بھی کم و بیش یہی تھے۔ چنانچہ اپنے ایک خطبے میں سرسید کہتے ہیں۔

اس پرچے کے اجراء سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سویلائزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تاکہ جس حقارت سے سویلائزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں۔ وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قوم کہلاویں۔ (۶)

ایڈیسن اور سٹیل کے پرچوں کا وہ کردار بھی سرسید کے سامنے تھا جو انہوں نے شعر و ادب کے سلسلے میں ادا کیا تھا۔ ادب کے اسلوب میں روانی و شائستگی اور موضوعات میں سنجیدگی و عمدگی پیدا کرنے میں ان رسالوں نے انگلستان میں بڑا کردار ادا کیا تھا۔

چنانچہ سرسید کے لفظوں میں:

> اسپیکٹیٹر کے پرچوں میں انسان کے خیالات کے مخرج اور ان خیالات سے جو خوشیاں حاصل ہوتی ہیں ان کی تفریق نہایت خوب اور خوش اسلوبی سے بتلائی گئی اور اس سے نتیجہ یہ ہوا کہ شاعروں کے خیالات اور ان کے اشعاروں کی خیال بندی نہایت عمدہ اور درست ہوگئی لغو اور بے سروپا مضمون اشعار میں سے خارج ہو گئے اور ان کی جگہ ہر تاثیر مضامین نے جگہ پائی۔ (۷)

متذکرہ بالا اقتباسات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سرسید احمد خان ہندوستان کی فضا میں پنپنے والے

اردو شعروادب سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ ان کی اصلاح چاہتے تھے۔ چنانچہ قدیم شعروادب کے اسالیب، مضامین، لفظوں اور استعاروں کے انتخاب واستعمال سبھی میں وہ تبدیلی لانا چاہتے تھے۔ جو ان کی آئندہ آنے والی زندگی اور نسلوں کے حق میں بہتر ہو۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے۔ تو سرسید ایک بہت بڑے ادبی نقاد بھی ٹھہرتے ہیں یہ بات درست ہے کہ سرسید نے بذات خود ادب پر یا ادب کی کسی صنف پر کوئی باقاعدہ کتاب تصنیف یا تالیف نہیں کی تاہم اس بات سے بھی انکار کرنا سراسر ناانصافی ہوگی کہ سرسید میں ادبی تنقید کا شعور نہیں تھا۔ سرسید کے تنقیدی خیالات خصوصاً قدیم شاعری، اس میں سے بھی غزل کے حوالے سے ان کا انتقادی حاسئہ خاصا شدید نوعیت کا تھا۔ ۱۸۵۷ء سے قبل کا اردو ادب ایک اعتبار سے غزل ہی کی قیادت میں محوسفر رہا تھا۔ چنانچہ تنقید کا پہلا تیر بھی غزل ہی کے سینے میں پیوست ہوا۔ سرسید نے اردو شعروادب کے بارے میں جیسی اور جتنی بھی تنقیدی باتیں کی تھی۔ ان میں سے بیشتر کا رخ غزل ہی کی جانب ہے۔ انہوں نے غزل کا نام واضح طور پر تو نہیں لیا۔ تاہم تنقید میں استعمال کیے گئے الفاظ و اصطلاحات اور زیرنقد آنے والے اسالیب وموضوعات میں سے اکثریت کا تعلق غزل ہی سے ہے۔ مثلاً ان کی اس تنقیدی رائے کو ملاحظہ کیجئے۔

> فن شاعری جیسا ہمارے زمانے میں خراب اور ناقص ہے اس سے زیادہ کوئی چیز بری نہ ہوگی۔ مضمون تو بجز عاشقانہ کے اور کچھ نہیں ہے۔ وہ بھی نیک جذبات انسانی کو ظاہر نہیں کرتا۔ بلکہ ان بد جذبات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جو ضد حقیقی تہذیب واخلاق کے ہیں۔ **(۸)**

اس اقتباس میں عاشقانہ مضامین اور جذبات کی جو بات کی گئی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ سرسید کا روئے خطاب غزل کی طرف ہے کیونکہ اصناف ادب میں سے غزل ہی ایک ایسی صنف ہے جس میں قلبی واردات و کیفیات اور جذبات کو شعری پیرایہ دیا گیا ہے۔

سرسید کے انتقادی حاسئے کی زد میں عذر سے پہلے کا پورا اردو ادب آیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے نظم کے ساتھ نثر پر بھی تنقید کی ہے۔

ملاحظہ کیجئے:

> علم وادب وانشا کی خوبی صرف لفظوں کے جمع کرنے اور ہم وزن اور قریب التلفظ کلموں کے تک ملانے اور دور از کار خیالات بیان کرنے اور مبالغہ آمیز باتوں کے لکھنے پر منحصر ہے۔ **(۹)**

متذکرہ بالا اقتباسات کی روشنی میں یہ بات قطعی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ سرسید اردو کے قدیم شعروادب

میں موضوعاتی، اسلوبیاتی، لفظی و لسانی اور مقاصد کے لحاظ سے تبدیلی کے خواہاں تھے۔ وہ ادب کو سماج کی عکاسی، معاشرتی بہبود، فکری بلندی و بالیدگی میں موثر جانتے تھے۔ ادب کی اس تاثیر و صلاحیت کے پیش نظر وہ اس کے مروجہ موضوعات و اسالیب میں نیا خون زندگی دوڑانا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے لفظوں میں سرسید نے اردو شعر و ادب کو۔

> افادی عمل کی حیثیت سے دیکھا اور ان کو تکمیل حیات اور ترقی کے لیے اہم کارندہ اور وسیلہ قرار دیا اس لیے سرسید اردو کے غالباً سب سے پہلے ترقی پسند ادیب اور نقاد تھے کہ وہ ادب کو محض تفریح اور بے غرض مسرت کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے۔ (۱۰)

نقد غزل کے سلسلے میں سرسید احمد خان کے انتقادی خیالات کے کئی ایک زاویے بنتے ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ سرسید غزل میں سے ایسے مضامین و موضوعات کا اخراج چاہتے تھے جن کا قومی زندگی میں کوئی تعمیری کردار نہیں۔ ذاتی اور انفرادی رجحانات و واردات کے بیان کی سرسید کے ہاں اتنی اہمیت نہیں جتنی قومی و اجتماعی معاملات کے بیان کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ غزل کے اسلوب و ادا پر بھی انگلی اٹھاتے ہیں اور اس کے ایمائی، تشبیہاتی اور استعاراتی اسلوب کی جگہ سلیس و سادہ اور ٹوک انداز کی تائید و تمنا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہاں کسی کو یہ غلط فہمی قطعاً نہیں ہونی چاہیے کہ سرسید اردو غزل کے سرے سے ہی مخالف تھے یا وہ غزل کو عدم آشنا کرنا چاہتے تھے یا غزل کے مروجہ مضامین کو یکسر و یک قلم مسترد کر دیتے تھے۔ ایسا قطعاً نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سرسید غزل کے مروجہ مضامین کی محض اصلاح کر کے اس میں موضوعاتی تنوع پیدا کرنا چاہتے تھے تاکہ غزل محض عشقیہ مضامین کی صنف بن کر رہ جانے کے بجائے حیات و کائنات کے چلتے پھرتے اور زندہ و موجود موضوعات کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ سکے۔ چنانچہ اپنے ایک خطبے میں واقع الفاظ میں وہ کہتے ہیں:

> شاعروں نے اپنی ہمت عاشقانہ غزلوں۔۔۔ میں صرف کی تھی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان مضامین کو چھونا نہیں چاہیے تھا۔۔۔ مگر نقصان یہ تھا کہ ہماری زبان میں صرف یہی تھی۔ دوسری قسم کے مضامین جو درحقیقت وہی اصلی مضامین ہیں اور نیچر سے علاقہ رکھتے ہی نہ تھے۔ (۱۱)

چونکہ انیسویں صدی میں مغرب میں انتقادی نظریات و خیالات نسبتاً تیزی سے پھل پھول رہے تھے۔ یورپ سے نئے تنقیدی خیالات و افکار کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ سرسید کی نظر بھی ان مغربی تنقیدی زاویوں کی چمک سے خیرہ ہو چکی تھی۔ جن کی وہاں دھوم تھی۔ چنانچہ سرسید کا حاسۂ انتقاد مشرقی شعر و ادب کو اس زاویے کا حامل تھا۔ جس زاویے سے مغرب میں ادب کو دیکھا جاتا تھا۔ مغرب میں اس عہد میں ادب کو نقد حیات کا آلہ تصور کیا جاتا تھا۔ طرز

حیات سکھانے کا ایک اہم ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ میتھیو آرنلڈ کا خیال اس معاملے میں بالکل واضح اور مکمل مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے خیال میں:

> انتقاد کا مقصد انسان کو زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ سکھانا ہے۔ ادب تصورات اور نظریات کا اظہار ہے اس لیے ادب کی حیات کے لیے عمل انتقاد کی بے حد ضرورت ہے۔ شاعر کو اپنی شاعری میں زندگی کی تصویر کشی کرنا ہوتی ہے اس لیے اسے دنیا اور انسانی زندگی سے پوری طرح باخبر ہونا چاہیے۔ (۱۲)

گویا شعروادب میں مقصدیت، اجتماعیت، حقیقت پسندی جیسے عناصر وامور کو انیسویں صدی کے مغربی انتقادی پیمانوں میں بڑی اہمیت حاصل تھی یہی امور سرسید کے ہاں اور بعد میں علی گڑھ تحریک کے توسط سے حالؔی وشبلی کے ہاں مرکزیت حاصل کر گئے۔ شعروغزل میں خارجی حقیقت کے مطابق مضامین کا بیان، سادہ ودل پسند اسلوب اور صاف وروان زبان کا تقاضا دراصل پوری انیسویں صدی کے اس عمومی رجحان کی عکاسی کرتا ہے جو یورپ میں ابھر رہا تھا۔ سرسید کے ہاں بھی یہ رجحان اہمیت پاتا ہے۔ وہ شعر شاعری کو حتی المقدور نیچر کے قریب تر لانے کی تلقین و سعی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ نیچر سے سرسید کی کیا مراد ہے۔ اس بارے میں پروفیسر عزیز احمد نے لکھا ہے۔

> سرسید احمد خان نے ''نیچر'' کی اصلاح سے وہی مفہوم لیا ہے جو انیسویں صدی کے سائنسدان لیتے ہیں یعنی ایک ایسا جامع نظام عالم جو میکانیات اور طبیعات کے کچھ قوانین کا پابند ہے اور غیر متغیرانہ طور پر رویے اور کردار کی یکسائی کے وصف سے متصف ہے جس میں استثنا کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔۔۔ (۱۳)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ نقد غزل کے سلسلے میں سرسید کی کوشش اور نقطہ نظر یہ تھا کہ غزل کے مضامین بھی ''نیچر'' کے موافق ہونے چاہیں۔ ایسے مضامین وخیالات بیان نہیں کیے جانے چاہیں جن کا فطری اور طبعی اصولوں اور نظام کائنات کے سائنسی انداز سے اثبات یا ربط قائم نہیں کیا جاسکتا ہو۔ اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ سرسید اردو غزل کو بھی سائنسی انداز عطا کرنے کے خواہاں تھے۔

انیسویں صدی میں بطور مجموعی مذہب کے ماوراء الطبیعات امور کے مقابلے میں سائنس کے مشاہداتی اعمال واشیاء کو، جذبائیت اور انفعالیت کے مقابلے میں عقلیت اور استدلالیت کو لسانی پر پیچ انداز بیان کے مقابلے میں فطری سادگی وروانی کو اہمیت مل رہی تھی۔ تخیلات وتصورات کی دنیا میں جینے کے مقابلے میں خارجی موجودہ حالات وحادثات سے نبرد آزمائی کرنے کا رجحان فروغ پا رہا تھا۔ اسی عمومی رجحان کے تمام عناصر وزاویے تحریک سرسید اور اس سے وابستہ ادباء وفضلا کے ہاں بھی راہ پا گئے تھے۔ چنانچہ معاشرتی، سماجی، مذہبی، سیاسی، تعلیمی تمام

سطوح پر متذکرہ بالا میلانات محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ شاعری پر خصوصاً غزل پر سرسید کا اس حوالے سے یہ اعتراض قابل غور ہے۔

> خیال بندی کا طریقہ اور تشبیہ و استعارہ کا قاعدہ ایسا خراب و ناقص پڑ گیا ہے جس سے ایک تعجب تو طبیعت پر آتا ہے مگر اس کا اثر مطلق دل یا خصلت میں یا اس انسانی جذبہ میں جس سے وہ متعلق ہے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ شاعروں کو یہ خیال ہی نہیں ہے کہ فطرتی جذبات اور ان کی قدرتی تحریک اور ان کی جبلی حالت کا کس پیرایہ یا کنایہ و اشارہ یا تشبیہ و استعارہ میں بیان کرنا کیا کچھ دل پر اثر کرتا ہے۔ **(۱۴)**

متذکرہ بالا اقتباس میں سرسید نے اُردو شعر و شاعری میں رائج خیال بندی کے اسلوب، فنی امور کے بے جا و غیر متناسب استعمال، مضامین کے غیر فطری پن اور اسلوب کے بے اثر ہونے پر اعتراض کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اب قدیم شاعری اور اس کے نظام کو موجودہ زمانے کی دگرگونی، حوادث اور تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے قابل نہیں جانتے ہیں چنانچہ اس میں عصر حاضر کے مطابق بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں لانے اور سماج سے اسے ہم آہنگ کرنے کے متمنی نظر آتے ہیں۔ مختصر یہ کہ سرسید احمد خان کا ادبی انتقادی نقطہ نظر مکمل طور پر افادی اور مقصدی پہلو کا حامل ہے۔ یہ مقصدیت ان کے عہد کی ایک سیاسی، سماجی ضرورت ہونے کے علاوہ ادبی و علمی ضرورت بھی تھی۔ قومی سرگرمیوں میں حد درجہ مشغول ہونے کے باعث ''ان کے تنقیدی تصورات میں ارتکاز فکر پیدا نہ ہو سکا'' **(۱۵)** ان کے مضامین و خطبات میں بین السطور موجود انتقادی خیالات اگرچہ کسی مبسوط تنقیدی کتاب کی حیثیت نہیں رکھتے۔ تاہم بعد کی پوری جدید اردو تنقید کے لیے ایک مضبوط بنیاد کی حیثیت ضرور رکھتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ روبینہ شہناز، ڈاکٹر، ''اردو تنقید میں پاکستانی تصورِ قومیت'' مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اول ۲۰۰۷ء، ص ۲۴

۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی مختصر تاریخ''، عزیز بک ڈپو، اردو بازار، لاہور، طبع سوم ۱۹۹۸ء، ص ۲۸۱

۳۔ رشید امجد، ڈاکٹر، ''میراجی، شخصیت اور فن''، نقش گر، راولپنڈی، ۲۰۰۶ء، ص ۲۷

۴۔ روبینہ شہناز، ڈاکٹر، اردو تنقید میں پاکستانی تصور قومیت''، ص ۲۷

۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی تحریکیں''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، طبع چہارم، ۱۹۹۹ء، ص ۳۲۱

۶۔ سر سید احمد خان، ''مقالات سر سید (حصہ دہم)'' مرتبہ: محمد اسماعیل پانی پتی، مولانا، مجلس ترقی ادب لاہور، طبع اول، ۱۹۶۲ء، ص ۳۵

۷۔ ایضاً، ص ۴۵

۸۔ ایضاً، ص ۴۷

۹۔ ایضاً، ص ۴۵

۱۰۔ عبداللہ، ڈاکٹر سید، ''سر سید احمد خان اور ان کے نامور رفقا''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع سوم، ۱۹۹۴ء، ص ۱۹۰

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۶۰

۱۲۔ میتھیو آرنلڈ، بحوالہ پروفیسر، عابد علی عابد، ''اصول انتقاد ادبیات''، سنگ میل، پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۱۴۱

۱۳۔ عزیز احمد، پروفیسر، ''برصغیر میں اسلامی جدیدیت''، مترجم: جمیل جالبی، ڈاکٹر، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، طبع سوم ۲۰۰۶ء، ص ۵۷

۱۴۔ سر سید احمد خان، ''مقالات سر سید (حصہ دہم)''، ص ۴۷

۱۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی مختصر تاریخ''، طبع سوم، ۱۹۹۸ء، ص ۳۷۹